نے پھر اپنا اپنا فرض ادا کیا ۔ بندر نے پانی پڑنے پر آنکھیں کھولیں ، بے بسی سے اپنے دردمندوں کو دیکھا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں ۔

بندر چھتوں چھتوں کودتے پھاندتے آئے ۔ لگتا تھا کہ سب سڑک پہ اتر آئیں گے ، مگر بس وہ منڈیروں پہ منڈلاتے رہے ، چیختے چلاتے رہے ۔ پھر ایک دم سے چپ ہو گئے جیسے کسی خوف نے انہیں آ لیا ہو ۔ پھر منڈیریں خالی ہونے لگیں ۔

شام ہو رہی تھی ۔ موٹا بندر ابھی تک سڑک پہ پڑا تھا ۔ آس پاس کی کسی منڈیر پہ کہیں کوئی بندر نہیں تھا ۔ روپ نگر اپنے تین بندروں کی بھینٹ دے کر بجلی کے زمانے میں داخل ہو گیا اور بندر ایسے غائب ہوئے کہ ہفتوں تک کسی منڈیر ، کسی چھت ، کسی درخت پہ کوئی بندر دکھائی نہیں دیا ۔ اور تو اور کالے مندر کے بڑے پیپل پہ بھی ، جہاں ہر موسم ، ہر دنوں میں بندر شاخ شاخ اچکتے لٹکتے نظر آتے تھے ، سناٹا تھا ۔

روپ نگر کا نرجن بن اسی کالے مندر سے شروع ہوتا تھا ۔ دیواروں اور گنبد پر اتنی کائی جم گئی تھی اور جم کے کالی پڑ گئی تھی کہ پورا مندر کالا کالا دکھائی پڑتا تھا ۔ اندر باہر سب سنسان جیسے صدیوں سے یہاں نہ سنکھ پھنکا ہو ، نہ کسی پجاری نے قدم رکھا ہو ۔ جتنا اونچا مندر تھا اتنا ہی اونچا اس کا پیپل جس کی ٹہنیوں پر سدا بندر جھولتے رہتے ۔ سوائے ان دنوں کے جب ادھر کوئی لمبی رسی جیسی دم اور کالے منہ والا لنگور آ نکلتا کہ اُس کے دیکھتے ہی بندر غائب ہو جاتے ۔ کالے مندر سے آگے کربلا تھی کہ سال میں ایک عاشور کے دن کے سوا ویران دکھائی دیتی جیسے مچ مچ کربلا ہو ۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک ٹیلہ جس پہ عمارت کے نام ایک برجی کھڑی رہ گئی تھی اور قلعہ کہلاتی تھی ۔ آگے راون بن بالکل اجاڑ ، دور تک میدان ہی میدان جس کے بیچوں بیچ ایک بھاری بڑھ کا پیڑ کھڑا تھا ۔ بستی سے نکل کر بندو اور حبیب کے ساتھ گرمی کی دوپہروں میں گھومتا پھرتا جب وہ اس طرف آ نکلتا اور کالے مندر کی سرحد کو پار کر لیتا تو اسے لگتا کہ وہ کسی دوسرے براعظم میں داخل ہو گیا ہے ۔ کسی بڑے جنگل میں جہاں پتہ نہیں کس گھڑی کس مخلوق سے مڈھ بھیڑ ہو جانے ، اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ۔

کالے مندر والے بندروں سے شاد آباد پیپل سے گزرتے گزرتے وہ ٹھٹکا

"یار ـــــ" اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا ۔

"کیا ہے بے ؟" حبیب نے بے پرواہی سے پوچھا ۔

"آدمی ۔" اس نے ڈری ہوئی آواز میں کہا ۔

"آدمی ! کہاں ؟" حبیب اور بندو دونوں ایک دم سے چونکے ۔

"وہ ۔" اس نے قلعے کی طرف انگلی اٹھائی جہاں ایک اکیلا آدمی چلتا نظر آ رہا تھا ۔

اس نرجن بن میں آدمی ! کیوں ؟ کیسے ؟ آدمی ہی ہے یا ـــــ مگر خود آدمی کے ہونے کا خوف بے پایاں تھا ۔ بس وہ ایک دم سے الٹے پیروں بھاگ کھڑے ہوئے ۔

بندو تو اسی گھر میں رہتا تھا کہ شریفن بوا کا پوت تھا ۔ حبیب سے یارانہ تھا ۔ دونوں کے ساتھ اس نے کتنی آوارہ گردی ، کتنی دشت نوردی کی تھی مگر صابرہ کے آنے کے بعد اس کی آوارہ گردی میں فرق پڑتا چلا گیا ۔

صابرہ ، پہلے تو اس نے اس کا صرف نام سنا تھا ، جب خالہ جان کا گوالیار سے خط آتا اور اس میں لکھا ہوتا کہ طاہرہ اور صابرہ اچھی ہیں ۔ سب سلام کہتی ہیں ۔ خالہ جان گوالیار میں رہتی تھیں کہ خالو جان ، جو بی اماں کے بھتیجے تھے ، وہیں ملازم تھے ۔ مگر ایک دن تار آیا خالو جان کے دنیا سے اُٹھ جانے کا ۔ امی نے روٹی پکاتے پکاتے توا اُلٹ دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئیں ۔ بی اماں بین کر کر روئیں ۔

بس اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ساسان اور سواریوں سے لدا پھندا اور چاروں طرف سے چادر سے تنا ہوا اکّا گھر کے پھاٹک کے سامنے آ کر رکا ۔ ابا جان ایک لمبی چادر لے کر باہر آئے ۔ ایک کونا اُسے پکڑایا ، ایک کونا خود پکڑا ۔ ایک سمت میں تو اس طرح پردہ کیا ، دوسری سمت میں کوئی آدمی چلتا پھرتا نظر نہیں آ رہا تھا ۔ پھر اکے کا پردہ اُٹھا ۔ خالہ جان اُتریں ۔ خالہ جان کے ساتھ دو لڑکیاں ، ایک طاہرہ باجی اور دوسری صابرہ جسے خالہ جان سبو کہہ کر پکار رہی تھیں ۔ بس لگتا تھا کہ اس کے برابر کی ہے ۔

پہلے تو صابرہ اس سے الگ الگ رہی ۔ وہ جھینپا جھینپا سا اس سے دور پھرتا رہا مگر کنکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا ۔ پھر جھجکتا جھجکتا اُس

کے قریب آیا "آؤ سبو کھیلیں ۔"

"میاں ذاکر" ابا جان داخل ہوتے ہوئے بولے "لگتا ہے کہ آج بھی یہ لوگ سونے نہیں دیں گے ۔"

"جی" وہ ہڑبڑا کر جنگل سے نکلا ۔

"میاں یہ لوگ جلسہ کر رہے ہیں یا ہلڑ بازی کر رہے ہیں ۔"

"ابا جان تحریکوں میں یہی ہوتا ہے ۔ جوش میں لوگ بے قابو ہو جاتے ہیں ۔"

"کیا کہا ، تحریک ؟ یہ تحریک ہے ؟ بیٹے کیا ہم نے تحریکیں دیکھی نہیں ہیں ۔ تحریکِ خلافت سے بڑی بھی کوئی تحریک ہوئی ہے ۔ اور مولانا محمد علی ، اللہ اللہ ! جب بولتے تھے تو لگتا تھا کہ انگارے برس رہے ہیں ۔ مگر مجال ہے کہ کوئی کلمہ تہذیب سے گرا ہوا ہو ۔ خیر وہ تو مولانا محمد علی تھے ، ہم نے تو کبھی کسی رضا کار کو بھی تہذیب سے گری ہوئی بات کرتے نہیں دیکھا ۔ انگریز کو مردہ باد کہا اور بات ختم کر دی ۔"

ابا جان چپ ہوئے ۔ پھر جیسے یادوں میں کھو گئے ہوں ، بڑبڑانے لگے "بس اس بزرگ سے ایک ہی خطا ہوئی کہ جنت البقیع کے معاملے میں ابنِ سعود کی حمایت کی تھی ۔ اللہ تعالیٰ اُس کے اس گناہ کو معاف کرے اور اُس کی قبر کو نور سے بھر دے ۔ بعد میں وہ خود بھی اس حمایت پہ بہت پچھتائے تھے ۔"

وہ دل ہی دل میں مسکرایا ، ابا جان بھی خوب ہیں ۔ ابھی تک تحریکِ خلافت کے خواب دیکھ رہے ہیں ۔

"اور تم کیا کر رہے ہو ؟"

"خیال تھا کہ صبح کے لیے لیکچر تیار کروں گا لیکن ——"

"اس شور میں کوئی کام ہو سکتا ہے ۔" ابا جان نے بات کاٹتے ہوئے کہا ۔

"ہاں بہت شور ہے مگر جلسہ شاید آج جلدی ختم ہو جائے ۔ کل تو باہر سے آئے ہوئے لیڈروں کی وجہ سے لمبا کھنچا تھا ۔"

"میاں مجھے تو جلدی ختم ہوتا نظر نہیں آتا ۔" رکے ، پھر بولے "ہمارے زمانے میں بھی جلسے ہوتے تھے ۔ شور ہوتا بھی تھا تو جلسے سے

پہلے ۔ مقرر سٹیج پہ آیا اور لوگ مؤدب ہو کر بیٹھ گئے ۔ کیا تہذیب تھی اُس زمانے کی ۔"

پھر وہ مسکرایا ۔ ابا جان تحریکِ خلافت کے زمانے سے ابھی تک باہر نہیں آئے ہیں ۔ مگر جب وہ یوں سوچ رہا تھا تو اسے لگا کہ جیسے وہ بھی ابا جان کے پیچھے پیچھے گزرے زمانے میں چلا جا رہا ہے ۔ کیا تہذیب تھی اُس زمانے کی ۔ کبھی کوئی اونچی آواز میں بولا تو ابا جان نے فوراً سرزنش کی ۔ میاں ہم اُونچا نہیں سنتے ۔ اور کبھی طاہرہ باجی نے تیز لہجے میں بات کی تو بی اماں نے ٹوکا "ارے لڑکی تیرے گلے میں کیا پھٹا بانس رکھا ہے ۔" اور جب ساون بھادوں کی ترنگ میں طاہرہ باجی نے سہیلیوں کے ساتھ لمبے لمبے جھولے لیے تھے اور اُونچی آواز میں ہنسی تھیں تو بی اماں نے فوراً ٹوک دیا تھا ۔ "بیٹی یہ کیا ٹھیکرے پھوٹ رہے ہیں ۔" ساون بھادوں ، جھولا ، گیت ، پکی نیم کی نبولی ——

"اچھا ، ہم چلتے ہیں ۔ نیند تو آئے گی نہیں ۔" یہ کہتے ہوئے ابا جان واپس جا رہے تھے ۔ "اور اب تم بھی آرام کرو ۔"

اس نے ان کی بات سنی ان سنی کی ۔ ایک دور کی آواز اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی :

پکی نیم کی نبولی ساون کب کب آوے گا
جیوے موری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا

طاہرہ باجی اپنی سہیلی کے ساتھ کتنے لمبے لمبے جھونٹے لے رہی تھیں اور صابرہ کتنی حسرت سے انھیں دیکھ رہی تھی ۔ اسی آن باورچی خانے سے خالہ جان کی آواز آئی "طاہرہ !"

"جی ۔"

"بیٹی ! کب تک جھولا جھولو گی ۔ کڑھائی پہ آ کے بیٹھو ۔ تھوڑی پھلکیں پکا لو ۔"

طاہرہ باجی کے چلے جانے کے بعد وہ سبو کے پاس آیا "سبو آؤ جھولا جھولیں ۔"

جب وہ صابرہ کے ساتھ لگ کر جھولے میں بیٹھا تو لگا کہ نرمی اس کے اندر اُتر رہی ہے ، گھل رہی ہے ۔ جی چاہ رہا تھا کہ بس اسی طرح

جھولتا رہے مگر صابرہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ۔ "ہم تیرے ساتھ نہیں جھولتے ۔" وہ اچانک جھولے سے اُتر پڑی ۔

"کیوں ؟" ہکا بکا رہ گیا ۔

"بس نہیں جھولتے ۔"

وہ حیران اور اُداس کھڑا رہا ۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا

"سبو ۔"

"ہم تجھ سے نہیں بولتے ۔"

صابرہ کو جب وہ کسی طور منا نہ پایا تو وہ اُداس اُداس وہاں سے چلا ۔ یوں ہی اس کا رخ زینے کی طرف ہو گیا ۔ زینہ چڑھ کر وہ اُوپر کھلی چھت پر پہنچ گیا ۔ چھت کچی تھی اور چونکہ مینہ کو بند ہوئے دیر ہو چکی تھی اس لیے مٹی جم گئی تھی ۔ جیب سے چاقو کا وہ ٹوٹا ہوا پھل نکالا جو پنسل بنانے کے لیے جیب میں رکھا کرتا تھا ۔ جمی ہوئی مٹی پر نوک کو اس طرح چلانا شروع کیا جیسے شکر پارے کاٹ رہا ہو ۔ تھوڑی دیر میں صابرہ بھی بھٹکتی ہوئی وہیں آ پہنچی ۔ بڑی توجہ سے اسے شکر پارے کاٹتے دیکھتی رہی ۔ مگر اب وہ اپنے کام میں مصروف تھا ۔ صابرہ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا ۔ شکر پارے بناتے بناتے جب جی بھر گیا تو اپنے لیے ایک نئی مصروفیت پیدا کر لی ۔ جہاں مٹی زیادہ خشک ہوگئی تھی وہاں اس نے مٹی کو کریدا ۔ تھوڑا گڑھا بن گیا تو اپنا ایک پاؤں اس میں رکھا اور کریدی ہوئی ساری مٹی اس پہ جما دی ۔ پھر آہستہ سے اپنا پاؤں نکال لیا ۔ مٹی کا ایک غار سا بن گیا ۔ صابرہ بڑی توجہ سے دیکھتی رہی ۔ پھر بولی "یہ کیا ہے ؟"

"قبر ۔" اس نے صابرہ کی طرف دیکھے بغیر بے تعلقی سے جواب دیا :

"یہ قبر ہے ؟" صابرہ نے حیرت سے پوچھا ۔

"ہاں ۔"

حیرت سے قبر کو دیکھتی رہی ۔ پھر بولی اس طرح کے لہجے میں گرمی آ گئی تھی ۔ "ذاکر ہمارے لیے بھی قبر بنا دے ۔"

"خود بنا لے ۔" اس نے روکھا سا جواب دیا ۔

صابرہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر اپنی قبر آپ بنانے کا جتن کرنے

لگی ۔ مٹی بہت ساری کھرچی ۔ کھرچی ہوئی جگہ میں اپنا ننگا پاؤں رکھا ۔ پھر اُس پہ کھرچی ہوئی مٹی کو جمایا ۔ پھر آہستگی سے پاؤں نکالا ۔ پاؤں نکالتے ہی مٹی کی چھت گر پڑی ۔ وہ اس کی ناکامی پر کھلکھلا کر ہنسا ۔ مگر صابرہ نے حوصلہ نہیں چھوڑا ۔ دوسری دفعہ پھر اس نے کوشش کی ، پھر ناکام ہوئی ۔ تیسری دفعہ پھر کوشش کی اور اس مرتبہ اس نے واقعی اتنی نفاست سے پاؤں باہر نکالا کہ مٹی کا ریزہ تک نہیں گرا ۔ صابرہ نے اپنی کامیابی پر ناز کیا اور اس کی قبر پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی قبر کو دیکھا "میری قبر اچھی ہے ۔"

"ہوں ، بڑی اچھی ہے ۔" اس نے صابرہ کا منہ چڑایا ۔

"پاؤں ڈال کے دیکھ لے ۔"

اس تجویز پہ وہ ٹھٹھکا ۔ کچھ سوچا ۔ پھر دھیرے دھیرے کر کے اس نے اپنا پاؤں بڑھایا اور صابرہ کی قبر میں کھسکا دیا ۔ پھر دل ہی دل میں قائل ہوا کہ سبو سچ کہتی ہے ۔ اور اپنا پاؤں دیر تک اس نرم گرم قبر میں رکھے رہا ۔

اس کے بعد اس کی طبیعت کا تکدر خود بخود دور ہو گیا ۔ صابرہ سے اس کے تعلقات پھر سے خوشگوار ہو گئے ۔ جب دوسری مرتبہ بناتے بناتے صابرہ کی قبر ڈھے گئی تو اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کا گورا پاؤں صاف کیا ۔ پھر جیب سے سیپ نکالی ۔

"سبو سیپی لے گی ؟"

"ہاں لوں گی ۔" اُس نے للچائی نظروں سے سیپ کو دیکھا ۔

سیپ اُس سے لے کر صابرہ نے پیشکش کی "چل جھولا جھولیں ۔"

چھت سے اُترتے اُترتے انھوں نے طاہرہ باجی اور سہیلی کی آواز سنی :

اماں آڑو جامن گھلے دھرے اماں میں نہیں کھاؤں میری ماں
اماں تتا پانی بھرا دھرا اماں میں نہیں نہاؤں میری ماں
اماں دھانی جوڑا سلا دھرا اماں میں نہیں پہنوں میری ماں
اماں ساجن ڈولا لیے کھڑا اماں میں نہیں جاؤں میری ماں

وہ پلٹے اور پھر چھت پہ آ بیٹھے ۔ اب کیا کریں ۔ اس نے ایک نئی

تجویز پیش کی ۔

"سبو !"

"ہوں"

"آؤ دولھا دلھن کھیلیں ۔"

"دولھا دلھن ؟" وہ سٹپٹا گئی ۔

"ہاں جیسے میں دولھا ہوں اور تم دلھن ہو ۔"

"کوئی دیکھ لے گا ۔" وہ گھبرا گئی ۔

بس اسی دم ایک دم سے بادل گرجا کہ دونوں ڈر گئے اور فوراً ہی مینہ اس زور سے برسا کہ کھلی چھت سے زینے تک پہنچتے پہنچتے دونوں شرابور ہو گئے ۔

مینہ کا آغاز کتنا پر شور ہوتا ۔ اندر باہر سب جگہ ہلچل مچ جاتی مگر جب برسے ہی چلا جاتا ایک ہی رفتار سے تو فضا آہستہ آہستہ اُداسی سے بھر جاتی اور آوازیں خاموش ہوتی چلی جاتیں ۔ شام پڑے کسی موز کی بھٹکی آواز دور جنگل سے آتی اور اُداس برستی شام میں اور اُداسی پھیلا دیتی ۔ پھر رات ہو جاتی اور مینہ میں شرابور تاریکی گہری اور دبیز ہوتی چلی جاتی ۔ رات کے بیچ جب کبھی آنکھ کھلتی تو مینہ اُسی طرح برس رہا ہوتا جیسے ازل سے برس رہا ہے ، ابد تک برستا رہے گا ۔ مگر وہ رات آوازوں سے کتنی آباد تھی ۔

دیکھو شام نئیں آئے ، گھیری آئی بدری
اک تو کاری رات اندھیری ، ہرکھا برسے بیری بیری
نیناں نیند نہ سہائے ، گھیری آئی بدری
گھنشام نئیں آئے ، گھیری آئی بدری

"ارے یہ ہندنئیں آج کی رات سونے تھوڑا ہی دیں گی ۔ اُوپر سے مینہ برسے چلا جا رہا ہے ۔"

"بی اماں یہ جنم اشٹمی کا مینہ ہے ۔" شریفن بوا نے وضاحت کی ۔ "کنھیا جی کے پوتڑے دھل رہے ہیں ۔"

"ارے اب کنھیا جی کے پوتڑے دھل بھی چکیں ۔ جل تھل تو ہو گئے ۔" بی اماں نے کروٹ لے کر پھر سونے کی کوشش کی ۔ بس اسی

دم وسنتی کے چوبارے میں ڈھولک بجی ۔

پانی بھرن گئی راما جمنا کنروا
رہیا میں مل گئے نند لال
اے نندیا موری روئے

اور کہیں دور سے آواز آ رہی تھی :

رتیا ہے مجھے دار سجن آئیو کہ جائیو
پلنگ ہے لچک دار سجن آئیو کہ جائیو

سارا مینہ جنم اشٹمی کی رات ہی کو پڑنا تھا ۔ صبح جب وہ جاگا تو نہ بارش نہ بادل ۔ اردگرد سب کچھ روشن روشن ، دھلادھلا ۔ آسمان ، پیڑ ، بجلی کے کھمبے ، دیواریں ، منڈیریں ۔

"ذاکر ! چل بیر بہوٹیں پکڑیں ۔"

بندو کی تجویز کے ساتھ وہ فوراً ہی گھر سے نکل پڑا اور بیر بہوٹیوں کی تلاش میں کالے مندر سے گزر کر کربلا تک گیا ۔ زمین و آسمان یہاں اس گھڑی کتنے نرم اور اُجلے تھے اور گھاس میں جا بجا کتنی بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں ، نرم نرم مخمل جیسی ۔ انھیں چھونے میں اسے کتنی لذت مل رہی تھی ۔ نرم چیزوں کو چھونے کو اُس کا ان دنوں کتنا جی چاہتا تھا مگر چھو جانے پر بیر بہوٹی پنجے سمیٹ ساکت ہو جاتی اور مری ہوئی بن جاتی ۔ نرم چیزیں چھو جانے سے اتنا بدکتی کیوں ہیں ، وہ سخت حیران ہوتا ۔

"سبو ! یہ دیکھ ۔"

"ہائے اتنی بہت سی بیر بہوٹیں ۔" حیرت اور مسرت سے وہ کھل اُٹھی ۔ اور پھر وہ اس کے ساتھ کتنی گھل مل گئی ۔ ایک دم سے کتنی قریب آ جاتی تھی ، ایک دم سے کتنی دور چلی جاتی تھی ۔

"سبو ! آ کھیلیں ۔"

"نہیں کھیلتے ۔"

"میرے پاس کوڑیئیں ہیں ۔"

"میں کیا کروں ۔"

"یہ دیکھ ، پھرکنی ۔"

"ہوں ۔" اُس نے منہ چڑا دیا ۔

پھر وہ اکیلا ہی پھرکنی پھراتا رہا - بہت دیر تک - پھر اپنی چکٹی نکالی اور چکٹی گھمانی شروع کر دی - چکٹی گھمانے میں اُسے کتنا مزا آتا تھا -

سنتے ہیں لیلیٰ کا یہ دستور تھا

چکٹی گھماتے گھماتے ایک دم سے وہ چونکا "مجنوں آ گیا -" اور چکٹی کو بھول تیر کے موافق ڈیوڑھی کی طرف بھاگا - جب وہ پھاٹک میں کھڑا تھا تو دیکھا کہ صابرہ بھی برابر آ کھڑی ہوئی ہے "ذاکر ! یہ مجنوں ہے -"

"اور کیا مجنوں تو ہے ہی -"

گریبان چاک ، بال بکھرے ہوئے ، ایک ہاتھ میں پیالہ ، دوسرے ہاتھ میں اینٹ ، پیر میں زنجیر کہ چلنے میں چھن چھن کر رہی تھی - رک کر کھڑا ہوا :

سنتے ہیں لیلیٰ کا یہ دستور تھا
بھیک دیتی تھی جو آتا تھا گدا

ایک دن مجنوں بھی کاسہ ہاتھ لے
جا پکارا کچھ مجھے للّٰلہ دے

آئی لیلیٰ اور سبھوں کو کچھ دیا
ہاتھ سے مجنوں کے کاسہ لے لیا

ساتھ ہی اینٹ زور سے ماتھے پہ ماری کہ ماتھا خونم خون ہوگیا اور دھڑام سے زمین پر گر کر ساکت ہوگیا -

"ذاکر ! مجنوں مرگیا ؟" وہ بری طرح کانپ رہی تھی -

"نہیں ، مرا نہیں ہے -"

"نہیں ، وہ مرگیا -" وہ رو پڑی -

"اری پگلی اس نے مکر بھر رکھا ہے -"

"نہیں ، مجنوں مرگیا -" وہ روئے جا رہی تھی -

مجنوں ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا - وہ حیران رہ گئی - پیالہ سنبھال جس میں دیکھنے والوں نے کچھ پیسے ڈال دیے تھے ، وہ آگے بڑھ لیا -

"سبو ! تو نے لیلیٰ مجنوں دیکھا تھا ؟"

"نہیں ، کیا ہوتا ہے اس میں ؟"

"اس میں ماسٹر روپی مجنوں بنتا ہے اور الٰہی جان لیلیٰ بنتی ہے -"

"پھر کیا ہوتا ہے ؟"

"پھر ماسٹر روپی الٰہی جان پہ عاشق ہو جاتا ہے -"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور جھینپ گئے - پھر فوراً ہی صابرہ کے تیور بدل گئے - "چل بےشرم ، ابھی بتاتی ہوں جا کے بی اماں کو -"

"میں نے کیا کہا ہے ؟" وہ گھبرا گیا -

مگر ایسی بات بی اماں کو بتاتی کیسے - بس اُس سے روٹھ گئی اور دور دور پھرنے لگی - وہ خود جھینپا ہوا تھا - اُس سے آنکھ ملاتے جھجکتا تھا -

"کوں باس ، کوں باس -" یکدم اس کے کان کھڑے ہوئے ، قریب اور دور سے آتی آوازوں کا اس پر عجب اثر ہوتا تھا - سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں ، وہ ان کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا - "کوں باس" - یہ کیا لفظ ہے ، یہ کبھی اُس کی سمجھ میں نہ آیا - بس وہ اتنا جانتا تھا کہ جب وستی کے پتا لالہ چونی مل چھت پہ کھڑے ہو کر یہ صدا لگاتے ہیں تو کوے کہاں کہاں سے آ کر ان کے سر پہ منڈلانے لگتے ہیں - وہ تیر کی طرح اپنی چھت پہ گیا - پیچھے پیچھے صابرہ -

سامنے وستی کی چھت پہ دو بڑی بڑی پتلیں بچھی تھیں - ان پر دودھ میں پکے چاول رکھے ہوئے - چاولوں پر کوے ٹوٹے پڑ رہے تھے - کوئی کوئی چیل منڈلاتی آتی اور پتل پہ جھپٹا مارتی - لالہ چونی مل کھڑے آواز لگا رہے تھے : "کوں باس ، کوں باس -" اور چیل کووں کی ایک گھٹا ان کے سر پہ چھائی ہوئی تھی -

"پتہ ہے کیا بات ہے ؟" اُس نے صابرہ کی حیرت دیکھ کر اسے معلومات فراہم کرنے کی ٹھانی - "رام چندر جی کی پتلیں صاف ہو رہی ہیں -"

"رام چندر جی کی پتلیں ؟" وہ اور حیران ہوئی -

"ہاں اور کیا - جب رام چندر جی بھوجن کر چکتے تھے تو کووں کا راجہ آ کے ان کا جھوٹا کھاتا تھا اور پتل صاف کرتا تھا -"

"چل جھوٹے -"

"اللہ قسم !"

"پوچھوں بی اماں سے ؟" اور اس نے فوراً جا کر بی اماں کے کان میں پرو دیا کہ ذاکر کیا کہہ رہا ہے ۔"

"بیٹے !" بی اماں نے اُسے گھور کے دیکھا "تو ہمارے گھر کیوں پیدا ہوا ، کسی ہندو کے گھر پیدا ہوا ہوتا ۔ باپ ہر وقت اللہ رسولؐ کرے ہے ۔ پوت کی خبر نہیں کہ ہندوانی قصوں میں پڑ گیا ہے ۔"

مگر بی اماں کا اب وہ چم خم نہیں رہا تھا ۔ پہلے ہی کی طرح سب پہ روک ٹوک کرتی تھیں ، ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھیں مگر آواز میں اب زیادہ دم نہیں رہا تھا ۔ مرجھا کے بالکل منقا بن گئی تھیں ۔ جیسے دھیرے دھیرے ڈھے رہی ہوں ۔ "بس اب تو یہ دعا ہے کہ پلنگ پہ پیٹھ لگنے سے پہلے اللہ مجھے اٹھا لے ۔"

"اے بی اماں ! کیا کہہ رہی ہو ۔ ابھی تو تمھیں پوتے کا سہرا دیکھنا ہے ۔"

"اے شریفن بوا ! ہڈی سے پیڑا تو لگ گیا ۔ اب میں کیا اللہ کی بوریئیں سمیٹنے کے لیے جیوں گی ۔"

بی اماں بے شک بہت جی چکی تھیں ۔ بتایا کرتی تھیں کہ ان کے بچپن میں صرف چھوٹی بزریا میں رات کو ایک مشال جلتی تھی ۔ باقی سب سڑکوں ، گلیوں میں اندھیرا رہتا تھا ۔ ان کے دیکھتے دیکھتے مشال رخصت ہوئی اور سڑکوں اور گلیوں میں لالٹینیں نصب ہو گئیں اور اب ان کی جگہ کھمبے کھڑے تھے اور سڑکوں پر جہاں تہاں بجلی کی روشنی نظر آتی تھی ۔

بجلی تو اب مسجد میں بھی لگنے لگی تھی مگر بیچ میں ابا جان نے کھنڈت ڈال دی ۔ "یہ بدعت ہے ۔" اور عصا لے کر مسجد کے دروازے پہ پاسبان بن کر کھڑے ہو گئے ۔ فٹنگ کرنے والے آئے اور جھڑکی کھا کر چلے گئے ۔ حکیم بندے علی اور منشی مصیب حسین نے انھیں بہت قائل کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے ایک ہی جواب دیا کہ "یہ بدعت ہے ۔"

پھرے کے تیسرے دن بی اماں کی طبیعت بگڑ گئی اور ایسی بگڑی کہ سانس چلنے لگا ۔ ابا جان پھرہ چھوڑ چھاڑ گھر آئے مگر بی اماں نے ان کے آنے کا انتظار نہیں کیا ۔

اگلے دن جب ابا جان فجر کی نماز کے لیے مسجد پہنچے تو دیکھا کہ بجلی لگ چکی ہے ۔ یہ دیکھ اُلٹے پاؤں آئے اور زندگی میں پہلی مرتبہ فجر کی نماز گھر پہ ادا کی ۔ پھر وہ کبھی مسجد میں نہیں گئے اور کبھی نماز گھر سے باہر نہیں پڑھی ۔ ہاں صبح شام بی اماں کی قبر پہ جا کے قرآن خوانی بہت دنوں تک کرتے رہے ۔

ابا جان نے روپ نگر میں پھیلتی بدعتوں کو روکنے کی کتنی کوششیں کی تھیں ۔ محرم پر جب تاشے بجنے لگے تھے تو انھوں نے منڈھے ہوئے تاشے پھاڑ دیے ۔ "تاشا بجنا از روے شریعت حرام ہے ۔ میں اسے مجلسوں اور زیارتوں کے ساتھ نہیں بجنے دوں گا ۔"

"مگر لکھنؤ میں تو ہر زیارت کے ساتھ تاشے بجتے ہیں ۔"

"بجا کریں ۔ لکھنؤ والے شریعت کو بدلنے کے تو مجاز نہیں ہیں ۔"

اس برس تو تاشے کسی مجلس میں ، کسی زیارت کے ساتھ واقعی نہیں بجے مگر اگلا برس آتے آتے ابا جان کا زور ٹوٹ چکا تھا ۔ ہر زیارت تاشوں کے ساتھ نکلی ، سوائے اس زیارت کے جو کھڑکی والے امام باڑے سے نکلتی تھی کہ یہ اپنا خاندانی امام باڑہ تھا اور اس پر ابا جان کا زور چلتا تھا ۔ اور پھر یہ زیارت کہ حضرتِ حر کی تھی ، روپ نگر کے محرم کی سب سے خاموش زیارت ٹھہری ۔ نہ تاشے ، نہ ڈھول ، نہ سوز خوانی کہ ابا جان سوز خوانی کو بھی شرع کے خلاف بتاتے تھے ۔ سوز خوانی کے خلاف بھی ابا جان نے محاذ قائم کیا تو تھا مگر اس محاذ کا بھی وہی انجام ہوا جو ان کے دوسرے محاذوں کا ہوا تھا ۔

روپ نگر پہ ابا جان کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی ۔ بی اماں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں اور بستی میں بجلی آ گئی تھی ۔ ابا جان بجلی کو مسجد میں آنے سے نہ روک سکے ، جس طرح وہ تاشے کو محرم میں راہ پانے سے نہ روک سکے تھے ۔ بجلی کے خلاف محاذ ، زمانے کی بدعتوں کے خلاف ان کا آخری محاذ تھا ۔ اس کے بعد وہ خانہ نشین ہو گئے ۔ گھر ہی میں نماز ادا کرتے ، گھر ہی میں بیٹھ کر محرم کے دسوں دن گزارتے ۔ پھر ایک روز انھوں نے جانماز پہ بیٹھے بیٹھے سفر کے لیے استخارہ کیا ۔ استخارہ آ گیا ، سفر کا سامان ہونے لگا ۔

"امی جان ہم جا رہے ہیں ؟" بی اماں کے گزر جانے کے بعد اب وہ

ہر بات امی سے پوچھتا تھا ۔

"ہاں بیٹا ۔" امی نے افسردگی سے کہا ۔ چپ ہوئیں ، پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگیں ۔ "اب ہمارا یہاں کیا رکھا ہے ۔ زمینیں پہلے ہی ٹھکانے لگ گئی تھیں ۔ ایک ٹوٹا پھوٹا گھر رہ گیا ہے مگر خالی گھر کو لے کے چاٹنا ہے ۔"

"امی ! ہم ویاس پور جا رہے ہیں ؟"

"ہاں بیٹا ! ویاس پور جا رہے ہیں ۔ تمہارے چچا تائے تو سب ویاس پور ہی میں ہیں ۔ بی امماں نے زمین پکڑی تھی ، نہیں تو ہم تو پہلے ہی یہاں سے جا چکے ہوتے ۔"

"امی ! ویاس پور بہت دور ہے ؟"

"ہاں دور ہی ہے ۔ یہاں سے بلند شہر تک تو لاری میں جائیں گے ۔ وہاں سے ریل میں سوار ہوں گے ۔"

باہر اکتا کھڑا تھا ۔ اس کے تصور میں لاری تھی اور ریل تھی ۔ وہ اجنبی سواریاں جن میں اسے زندگی میں پہلی مرتبہ سوار ہونا تھا ۔ امی جتنی اُداس تھیں وہ اتنا ہی خوش تھا ۔ سفر کرنے اور نئی بستی کو دیکھنے کا شوق اس کے یہاں یکایک جاگ اُٹھا تھا ۔ صابرہ جانے کس وقت یہاں آ کر کھڑی ہو گئی تھی ۔ اس سے دور کھڑی وہ بندھتے ہوئے بستروں اور تالا لگتے بکسوں کو تکے جا رہی تھی ۔ تکتی رہی ، پھر اچانک پاس کھڑی خالہ جان کے دامن میں منہ چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگی ۔ خالہ جان نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولیں : "اس میں رونے کی کیا بات ہے ۔ خالہ بی جلدی واپس آئیں گی ۔" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے ۔ امی نے صندوق میں تالا لگاتے لگاتے کہا ۔ "صابرہ !" رکیں ، پھر بولیں : "بیٹی ! میں وہاں پہنچ کے جلدی تمہیں بلاؤں گی ۔ بس تمہیں وہیں رکھوں گی اپنے پاس ۔" ابا جان نے بستر باندھتے باندھتے ایک نظر سسکیاں بھرتی صابرہ کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں غرق ہو گئے ۔

وہ دیکھتا رہا ۔ اس کی ساری خوشی زائل ہو چکی تھی ۔ ہمت کر کے آہستہ آہستہ اس کے قریب گیا ۔ "سبو ۔"

صابرہ نے بھیگے چہرے کے ساتھ (اتنی دیر میں اس کے سارے گال

آنسوؤں میں تربتر ہو گئے تھے) اسے دیکھا اور ایک دم سے پھر منہ خالہ جان کے دامن میں چھپا لیا اور پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ سسکیاں لینے لگی ——

"میاں ذاکر ! یہ کیا ہو رہا ہے ۔" ابا جان پھر اُس کے کمرے میں چلے آئے تھے ۔

"جی ، کچھ نہیں ۔" اس نے اس طرح کہا جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے ۔ اور فوراً کتاب کھول کے سامنے رکھ لی جیسے جتا رہا ہو کہ وہ اصل میں کتاب پڑھ رہا تھا ۔

"کچھ تو ہوا ہے ۔ بہت شور پڑا ہوا ہے ، اور مجھے لگتا ہے کہ گولی چلی ہے ۔ کچھ آواز سی آئی تھی ۔"

اس نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی اور سامنے جلسہ گاہ پر نظر ڈالی ۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے تھے اور نعرے لگا رہے تھے ۔ کچھ رضاکار قسم کے نوجوان کھڑے ہو جانے والوں میں سے کسی کو زبردستی بٹھانے کی اور کسی کو باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ بیچ مجمع میں دو ٹولیاں بننے لگی تھیں ۔ پھر ایک دھماکہ ہوا ۔ اس نے بیزاری کے ساتھ کھڑکی بند کی اور واپس ہوتے ہوئے ابا جان کو اطلاع دی : "گولی نہیں چلی ، پٹاخے چھوڑے جا رہے ہیں ۔"

"وہ کس خوشی میں ؟"

"تاکہ جلسہ درہم برہم ہو جائے ۔"

"کیا ہو گیا ہے لوگوں کو ۔"

"ابا جان ! آپ پریشان نہ ہوں ۔ یہ آج کل کے جلسوں کا معمول ہے ۔ آپ اب سو جائیں ۔"

"بیٹے تمہیں پتہ ہے کہ میری نیند ایک دفعہ اچٹ جائے تو پھر مشکل ہی سے آتی ہے ۔" چپ ہوئے ، پھر بڑبڑائے : "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ۔" اور بڑبڑاتے ہوئے نکل گئے ۔

اس نے اُٹھ کر پھر کھڑکی تھوڑی کھول کر جھانکا ۔ کھڑے لوگ بیٹھ گئے تھے مگر شور اب بھی بہت تھا ۔ اس نے کھڑکی بند کی ، بجلی گل کی اور بستر پہ جا لیٹا ۔ "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے" ابا جان کا فقرہ ذہن

میں گونجا ۔ واقعی ، لوگوں کو ہو کیا گیا ہے ؟ اس نے سنجیدگی سے سوچا ۔ گھروں میں ، دفتروں میں ، ریستورانوں میں ، گلیوں بازاروں میں سب جگہ ایک ہی نقشہ ہے ۔ بحث پہلے نظریاتی ، پھر ذاتی ، پھر توتکار ، پھر گالم گلوچ ، پھر سر پھٹول ۔ راہ چلتے لوگوں کا ٹھٹک کر کھڑے ہو جانا ، لڑنے والوں کو دہشت سے تکنا ، پھر ایک دوسرے سے پوچھنا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ؟ کیا ہونے والا ہے ؟ ہر ایک کی آنکھوں میں ایک خوف ، جیسے واقعی کچھ ہونے والا ہے ۔ پھر اپنی اپنی راہ چل پڑنا اور بھول جانا کہ کچھ ہوا ہے ۔ جیسے کچھ نہیں ہوا ہے ، جیسے کچھ نہیں ہوگا ۔ اتنی تشویش اور اتنی بے اعتنائی ! یکایک کوئی افواہ جیسے دفعتاً آندھی لوگوں کو آ لیتی ہے ۔ چہروں پر پھیلتا ہوا خوف و ہراس ۔ پھر وہی تشویش بھرا سوال کہ کیا ہونے والا ہے ؟ پھر اپنی اپنی راہ چل پڑنا اور بھول جانا ۔ جیسے کچھ نہیں ہوا ہے ، جیسے کچھ نہیں ہوگا ۔ مگر کیا واقعی کچھ ہونے والا ہے ؟ کیا ہونے والا ہے ؟ آگے کچھ نظر نہیں آتا تو پیچھے چل پڑنا ۔ پھر وہی یادوں کی گھنی بنی میں لمبا سفر ۔ جب میں روپ نگر میں تھا ـــ میری زندگی کا دیومالائی زمانہ ۔ اور جب میں ویاس پور آیا ـــ ویاس پور ـــ ///

"یہ مردہ جل رہا ہے ؟"

"ہمبے ، یو مرگھٹ ہے ۔ اور جی یو مردہ جو ہے یو جندہ ہے ۔"

"چل جھوٹی ۔"

"رام کسون ! جندہ ہے ۔ اُٹھ کے کھڑا ہوگیو ۔ ہےرام ! موری تو میا مرگئی ۔"

"اچھا پھر ؟"

"فیر وے لیٹ گیو اور ماں واں سے بھاگ آئی ۔"

"جھوٹی ۔"

وہ پھلو کے ایسے کسی بیان پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا ۔ اب وہ بچہ تھوڑا ہی تھا ۔ بی اماں کے گزر جانے اور روپ نگر سے نکل آنے کے بعد وہ جیسے ایک ساتھ بڑا ہو گیا تھا ، جیسے اس کا بچپن روپ نگر میں رہ گیا تھا ۔ روپ نگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا ۔ کچے پکے رستے جو

جانے کہاں جا کر نکلتے تھے ، بس درختوں میں گم ہوتے دکھائی دیتے تھے ۔ ڈولتے ہچکولے کھاتے اکے ، اونگھتی رینگتی بیل گاڑیاں ، کوئی کوئی رتھ کہ اس میں جتے توانا بیلوں کی گردنوں میں آویزاں گھنٹیوں اور گھنگھروؤں کی بدولت وہ مٹی میں اٹے رستے ایک میٹھے شور سے بھر جاتے ۔ کالا مندر ، کالے مندر کے احاطے میں کھڑا بندروں سے آباد بڑا پیپل ، کربلا کی ویران اور اُداس فصیل ، ٹیلے والا قلعہ ، راون بن ، راون بن کے بیچ کھڑا بھید بھرا برگد ، بس ایک پورا دیومالائی عہد تھا جو روپ نگر کے ساتھ رہ گیا تھا ۔ یہاں ہرچند کہ سامنے مرگھٹ تھا اور مرگھٹ میں کھڑے گھنے پیپل کے پیڑ مگر اسے وہاں کسی پیڑ کے اردگرد بھید بھری فضا کا احساس نہیں ہوا ، حالانکہ پھلو نے وہاں بہت کچھ دیکھا تھا ۔

"سو کو تو بھیا چڑیل نے پکڑ لیو ۔"

"چل چل بکواس مت کر ۔"

"رام کسون ! دوپہریا ٹیکم ٹیک ۔ وے جو پیپل دکھائی دیوت ہے ، وا کے تلے ایک کلھیا ، کلھیا میں چون کا پتلا اور سیندور اور تنک کھانڈ ۔ اور بڑھ کے تلے ایک بیربانی دانت نکوسے ایسی کاکلاوے جیسے چیل کاکلاوے ہے ۔"

بکواس مت کر ، جا اپنا کام کر ۔"

وہ ویاس پور میں کچھ اور دیکھ رہا تھا ۔ ہموار سڑکوں پر دوڑتے ہوئے ربڑ ٹائر تانگے ، بیچ بیچ میں کوئی بگھی ، کوئی موٹرکار ۔ ان سڑکوں سے آگے بازاروں اور محلوں سے پرے تارکول والی وہ چکنی چکنی سرمئی سڑک جس پر دن بھر لاریاں دوڑتی رہتیں ۔ ان سواریوں سے عجب سا شور پیدا ہوتا تھا ۔ وہ آوازیں اب کہاں تھیں جو روپ نگر کی فضا میں بسی ہوئی تھیں ۔ اب اس کے کان نئی آوازوں سے آشنا ہو رہے تھے ۔ بگھیوں اور تانگوں کی گھنٹیوں کی آوازیں ، لاری کے ہارن کی آواز ، موٹرکار کے ہارن کی آواز اور سب سے عجب ریل کی سیٹی کی آواز جو اسے روپ نگر سے دور لے آئی تھی اور ویاس پور سے پرے لیے جا رہی تھی ۔ ان جانے ، ان دیکھے شہروں کی طرف ۔ دور پرے سے آتی ریل کی سیٹی کی آواز کے ساتھ وہ کوٹھی کی چھت پہ پہنچا جہاں سے مرگھٹ کے اس طرف پھیلی ہوئی ریل کی پٹری صاف دکھائی دیتی ۔ ریل گاڑی دور سے سیٹی دیتی اور دھواں اگلتی آتی ، پہلے

درختوں کی اوٹ میں دوڑتی رہتی ، صرف اس کا دھواں فضا میں پھیلتا نظر آتا ، پھر اچانک درختوں کی اوٹ سے وہ کالا بھنور انجن نمودار ہوتا جو اپنے سے بھی زیادہ کالا دھواں آسمان کے رخ اگل رہا ہوتا اور اس کے پیچھے سوازیوں سے بھرے ان گنت ڈبے ۔ کس تیزی سے یہ ڈبے گزرتے چلے جاتے اور دم کے دم میں نظروں سے اوجھل ہو جاتے ۔ وہ حیران رہ جاتا ۔ پھر جب ابا جان کی بتائی ہوئی یہ بات اس کے دھیان میں آتی کہ یہ ریل گاڑی مراد آباد سے آ رہی ہے اور ویاس پور سے ہوتی ہوئی دلی جا رہی ہے تو وہ اور حیران ہوتا ۔

وہ یہاں خان بہادر تایا کی کوٹھی میں آ کر رہا تھا جو آبادی سے کسی قدر دور کھیتوں اور باغوں کے بیچ کھڑی تھی کہ اس کی چھت پہ کھڑے ہو کر دیکھو تو سامنے مرگھٹ ، مرگھٹ سے پرے ریل کی پٹری ، ریل کی پٹری سے پرے افق کی حدوں پر قطار میں کھڑے ہوئے درخت ۔ پھر جب وہ بازار جاتا تو ایک ایک دکان کو تعجب سے دیکھتا ۔ کھڑکی بازار روپ نگر کی چھوٹی بزریا کے مقابلے میں کتنا بڑا بازار تھا ۔ ایک دکان پر سائکلیں ہی سائکلیں ۔ اتنی سائکلیں اس نے کبھی کاہے کو دیکھی تھیں ۔ سائیکلوں ، جوتوں اور کپڑے کی دکانوں سے آگے وہ لمبا چوڑا چوک تھا جہاں جا بجا گیہوں اور کپاس کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور آس پاس جنگلی کبوتروں کی پوری برات اُتری ہوئی تھی ۔ دکانیں جن میں مال و اسباب کچھ نہیں ، بس چاندنی بچھی ہوئی ، چاندنی پر مسند ، مسند پر بیٹھا ہوا سیٹھ ، اس کے آگے ٹیلی فون رکھا ہوا ۔ ایک ساتھ شور پڑتا اور ہر سیٹھ ، ہر لالہ تیزی سے ڈائل گھماتا اور فون پہ زور زور سے باتیں کرتا ۔ وہ ششدر رہ جاتا ۔ رفتہ رفتہ اسے پتہ چلا کہ یہ شور اس وقت پڑتا ہے جب کسی جنس کا بھاؤ کھلتا ہے ۔

بازار میں اتنا شور ، کوٹھی کے آس پاس اتنی خاموشی ! جب ریل گاڑی آتی تب ہی یہ خاموشی ٹوٹتی ۔ اس کے گزر جانے کے بعد پھر خاموشی اور دور تک پھیلی ہوئی ریل کی پٹری جسے وہ چھت سے کھڑا دیر تک حیرت سے تکتا رہتا ۔ اس کی حیرتیں بھی اب سفر کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھیں اور کس قدر بدل گئی تھیں ۔

خان بہادر تایا نے یہ کوٹھی یہ سوچ کر بنوائی تھی کہ وہ پنشن ہو

جانے کے بعد یہاں آ کر رہیں گے ۔ رائے سینا میں عمر گزارنے کے بعد وہ ویاس پور کی گلیوں میں تو نہیں رہ سکتے تھے ۔ مگر وہ تو پنشن پانے سے پہلے ہی دنیا سے گزر گئے ۔ یہ واقعہ اس کے ویاس پور آنے سے بہت پہلے گزر چکا تھا ۔ اس نے خان بہادر تایا کو نہیں دیکھا تھا مگر ویاس پور آ کر پورے خاندان پر ان کی عظمت کے سائے کو منڈلاتے دیکھا ۔

"پھر بھائی خان بہادر مرحوم نے یہ ترکیب کی کہ باغی بن کے باغیوں میں مل گئے ۔ ایسے زبردست باغی بنے کہ ان کی کمیٹی کے صدر بن گئے ۔ مگر باغیوں کے بھی جاسوس لگے ہوئے تھے ۔ ایک جاسوس نے اُنھیں تاڑ لیا ۔ بیچ کمیٹی میں اس نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ یہ شخص تو انگریزوں کا جاسوس ہے ۔ بس پھر کیا تھا ، باغیوں نے بھائی جان پہ پستول تان لیے ۔" چچا جان بولتے بولتے رکے ۔ اچھے بھائی ، نجیب بھائی ، صاحب میاں سب بہت یکسوئی سے سن رہے تھے ۔

"پھر کیا ہوا ؟"

"اجی بھائی جان مرحوم کب چوکنے والے تھے ۔ انھوں نے ایسی تقریر کی کہ باغیوں کے پستول اسی باغی کی طرف مڑ گئے جس نے انھیں انگریزوں کا جاسوس بتایا تھا ۔" چچا جان رکے ، پھر بولے کہ "یہ باغی اتنے خطرناک تھے کہ بھائی خان بہادر مرحوم نے انھیں نہ پکڑا ہوتا تو وہ انگریزوں کا وہ حال کرتے جو سن ستاون میں ہوا تھا ۔ دہشت پسند تھے ۔ سارے ہندوستان میں انھوں نے تہلکہ ڈال رکھا تھا ۔"

خاندان میں جب کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوتی اور سب خاندان والے اکٹھے ہوتے تو بس چچا جان اسی طرح خان بہادر تایا کی باتیں شروع کر دیتے تھے اور بیٹے ، بھانجے ، بھتیجے اردگرد اکٹھے ہو جاتے اور اس طور سنتے جیسے کسی دیومالائی ہیرو کے قصے سن رہے ہیں ۔

"بھائی خان بہادر مرحوم کی ایک ٹانگ چاندی کی تھی ۔"

"چاندی کی ٹانگ ؟" نجیب بھائی نے تعجب سے پوچھا ۔

"ہاں ! بات یہ ہوئی کہ انھوں نے سلطانہ ڈاکو کا پیچھا کرتے کرتے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی ۔ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ۔ پھر رائے سینا میں وائسرائے کے سرجن نے ان کا علاج کیا اور پوری ٹانگ نکال کے چاندی

کی ٹانگ لگا دی ۔"

سب حیرت میں غرق ہو گئے ۔ پھر نجیب بھائی نے پوچھا : "تو سلطانہ ڈاکو کو تایا جان نے پکڑا تھا ؟"

"اور کس نے پکڑا تھا ؟ ینگ صاحب کے تو والد ماجد بھی آ جاتے تو سلطانہ کو نہیں پکڑ سکتے تھے ۔ یہ بھائی خان بہادر ہی کی ہمت تھی کہ اسے پکڑ لیا ۔ اور ریشمیں رومال والوں کو کس نے پکڑا تھا ؟"

"ریشمیں رومال والے ؟ وہ کون تھے ؟"

"ریشمیں رومال والے کون تھے ؟" چچا جان ہنسے : "بیٹو تمھیں معلوم کیا ہے ؟ ریشمیں رومال والوں نے انگریز کا تختہ اُلٹنے کا پورا منصوبہ بنا لیا تھا ۔ تنت وقت پہ بھائی خان بہادر مرحوم نے تاڑا اور ریشمیں رومال بیچ میں سے اچک لیا ۔" رکے ، پھر کہنے لگے : "انگریزوں پہ بھائی خان بہادر مرحوم کے بہت احسانات ہیں ۔ جب ہی تو ان کے مرنے پہ وائسرائے نے کہا تھا کہ خان بہادر کے مرنے سے میری کمر ٹوٹ گئی ۔"

"بھیا ! اپنے اس بھتیجے سے بھی تو پوچھو کہ اسے تایا کی طرح کچھ بننا ہے یا ڈنڈے ہی بجانے ہیں ۔"

"بیٹے ذاکر ! جواب دو ، بھابی جان کیا پوچھ رہی ہیں ؟ ایک بات ہم تمھیں بتائے دیتے ہیں ۔ بھائی خان بہادر آسانی سے خان بہادر نہیں بن گئے تھے ۔ محنت انھوں نے کتنی کی تھی ۔ جس محنت سے انھوں نے پڑھا تھا اس محنت سے آج کوئی پڑھ سکتا ہے ؟ ایک دفعہ کیا ہوا کہ ان کی لالٹین کا تیل ختم ہو گیا ۔ تیل کی بوتل جا کے دیکھی تو وہ خالی پڑی تھی ۔ انھوں نے کیا کیا کہ جگنو پکڑ کے بی اماں کے دوپٹے کے آنچل میں باندھے اور ان کی روشنی میں صبح اذان کے وقت تک پڑھتے رہے ۔ آج کوئی اس بات کا یقین کرے گا ؟ مگر پھر اس محنت کا انھیں صلہ ملا ۔ میٹرک کے امتحان کا جب نتیجہ آیا تو وہ یوپی بھر میں اول تھے ۔"

محنت سے تو وہ بھی پڑھ رہا تھا ۔ میٹرک کا امتحان سر پر تھا ۔ رات رات بھر لالٹین جلائے بیٹھا رہتا اور دن میں دن دن بھر سکول کے احاطے میں کھڑے آم کے پیڑ کے نیچے پڑاؤ ڈالے رہتا ۔ امتحان کی تیاری کے لیے سکول بند تھا ۔ کلاسوں کے کمرے مقفل ، برآمدے خالی ، فیلڈ میں سناٹا ۔

پڑھنے کے لیے یہ کتنی سازگار فضا تھی ۔ سکول کے اکلوتے آم کی چھاؤں میں وہ اور سریندر دونوں یکسوئی سے پڑھتے رہتے ۔ جب تھک جاتے تو سامنے کی اس تارکول والی سڑک کو تکنے لگتے جس پر کبھی کبھی کوئی لاری گزرتی نظر آتی اور پھر سڑک خالی ۔

"پتہ ہے یہ لاری کہاں جا رہی ہے ؟" سریندر نے اس سے پوچھا :

"کہاں جا رہی ہے ؟"

"میرٹھ ۔"

"میرٹھ ؟ یہ لاری میرٹھ جا رہی ہے ؟ تو نے میرٹھ دیکھا ہے ؟ کیسا ہے میرٹھ ؟" اُس نے ایک سانس میں کتنے سوال کر ڈالے ۔

میرٹھ کو اس نے پہلے سریندر کی آنکھوں سے دیکھا ۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ۔ کالج سے فراغت پا کر وہ اور سریندر دونوں کمپنی باغ کی طرف چل پڑتے ۔ چھاؤنی ، انگریزوں کی دنیا ، لمبی خاموش چکنی چکنی سڑکیں ، دو رویہ گھنے درختوں کے بیچ دور تک جاتی ہوئیں ، گم ہوتی ہوئیں ۔ کوئی گورا سفید کرمچ کے جوتے اور سفید نیکر قمیص پہنے ، ہاتھ میں ٹینس کا بلا سنبھالے ، تیزی سے قریب سے گزرتا اور آگے جا کے کمپنی باغ کے گیٹ میں مڑ جاتا ۔ سنہری بالوں ، گورے چہرے والی کوئی میم برابر سے گزرتی اور وہ دونوں حدِ نظر تک اس کی گوری ننگی پنڈلیوں کو دیکھتے رہتے ۔ پھر کوئی کالی آیا کسی دودھ جیسی رنگت والے بچے کو گاڑی میں بٹھائے آہستہ آہستہ گاڑی کو دھکیلتی چلی جاتی ۔

"یاں سے" سریندر چلتے چلتے رک کر کھڑا ہو جاتا "من ستاون کا اندولن شروع ہوا تھا ۔"

"یاں سے ؟" وہ چکرا کر اس جگہ کو دیکھتا اور سوچتا کہ اس جگہ میں کیا خاص بات ہے ؟ وہ دیکھتا رہتا ، سوچتا رہتا اور پھر اس جگہ کا رعب اس پہ طاری ہوتا چلا جاتا ۔

"یار سریندر !" وہ چلتے چلتے یوں ہی سوال کر ڈالتا "ہٹلر لندن کیسے پہنچے گا ؟ بیچ میں تو سمندر ہے ۔"

"استاد ! ہٹلر کے پاس ایسا برادہ ہے کہ سمندر پہ چھڑک دو تو وہ شانت ہو جائے اور پتھر سان بن جائے ۔"

پھر واپس کالج میں جہاں ہجوم تھا ، شور تھا ، سریندر نہ ہوتا تو وہ لڑکوں کے اس ہجوم میں کھو جاتا ۔ مگر پھر وہ پورا ہجوم کھو گیا معہ سریندر کے ۔ کسی لڑکے نے برآمدے سے گزرتے گزرتے نعرہ لگایا : "ہندوستان چھوڑ دو" ، کلاسوں میں جاتے ، کلاسوں سے نکلتے لڑکے ٹھٹکے ۔ پھر ایک دم سے نعروں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا "ہندوستان چھوڑ دو ـــ انقلاب زندہ باد ـــ مہاتما گاندھی کی جے" ، پھر کلاسوں کے شیشے ٹوٹنے لگے ۔ پھر کسی نے خبردار کیا : "وہ آ رہے ہیں ۔" بھگدڑ ، خالی ہوتے برآمدے ، سناٹا ، سناٹے میں دور سے آتی ہوئی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ۔ کالج میں گھڑ سوار پولیس آ رہی تھی ۔

برآمدے ، کمرے ، سبزہ‌زار ، ہفتوں ، مہینوں سنسان پڑے رہے ۔ جہاں تہاں بیٹھے ہوئے لٹھ بردار سپاہی کبھی اونگھتے ہوئے ، کبھی مستعدی سے کھڑے ہوئے ۔ مٹھی بھر مسلمان لڑکے ، پانچ سات ایک کلاس میں تو ڈھائی تین دوسری کلاس میں ۔ مگر پروفیسر مکرجی اب بھی اتنی ہی گرمجوشی سے اور اتنی ہی آواز میں لیکچر دیتے جیسے کچھ نہیں ہوا ہے ۔

امتحانوں کے آتے آتے لڑکے واپس آئے مگر گہما گہمی واپس نہیں آئی ۔ پھر چھٹیاں آ گئیں ۔ واپس پھر ویاس پور میں ۔ موسم اب کتنا بدل گیا تھا ۔ بدلتے بدلتے اتنا بدلا کہ لوئیں چلنے لگیں ۔ دوپہر ہوتے ہوتے گھروں کے دروازے بند ہو جاتے ، بیٹھکوں میں لگی خس کی ٹٹیاں پانی میں تربتر نظر آتیں ۔ مگر پتلی گلیاں دھوپ سے نا آشنا تھیں ۔ ان گلیوں میں کتنے گھر تھے کہ خس کی ٹٹی سے بے نیاز تھے ۔ ڈیوڑھیوں میں عورتیں چرخہ کاتتی ، باتیں کرتی نظر آتیں ۔

"تو نے دیکھا ؟" سریندر نے پتھر والی گلی سے جلدی جلدی نکلتے ہوئے پوچھا ۔

"نہیں یار ! مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دیا ۔"

"چوبارے میں جو کھڑی تھی اُسے نہیں دیکھا ؟"

"نہیں ، کون کھڑی تھی ؟"

"رم‌جھم اور کون ۔"

"رم‌جھم ؟"

"ہاں ، میں اُسے رم جھم کہتا ہوں ۔ بس تو اُسے دیکھے گا تو سالے ہلاک ہو جائے گا ۔"

ایک پھیرا ، دوسرا پھیرا ، تیسرا پھیرا ، پھر نظر ہی نہیں آئی ۔ "یار وہ تو غائب ہو گئی ۔"

سریندر مایوس نہیں ہوا تھا ۔ بندر والے کو دیکھ کر کھل اُٹھا ۔ "یار من ! اس کے ساتھ چلتے ہیں ۔"

بندر والا کڑی دوپہری میں ڈگڈگی بجاتا ایک گلی سے دوسری گلی میں ، دوسری گلی سے تیسری گلی میں ۔ آخر کو پتھر والی گلی میں تماشا شروع کیا ۔ بندریا نہیں مانی تو بندر نے اُسے ڈنڈے سے پیٹا ، اتنا کہ روٹھ کر میکے چلی گئی ۔

سریندر کی نظریں چوبارے پر جمی تھیں ۔ اُسے یقین تھا کہ وہ بندر کا تماشا دیکھنے ضرور آئے گی ۔

"اے سالے دیکھ ۔"

"کہاں ؟"

"چوبارے میں ، وہ کھڑی ہے ۔"

اس نے دیکھا ۔ سانولی رنگت ، دبلا دبلا نرم نرم بدن ۔

"اری ماں مُسلا ۔" ایک دم سے بھڑکی اور غائب ۔

پھر وہ اُسے نظر نہیں آئی ۔ نہ آئے ۔ سریندر نے اسے یہ تو سکھا ہی دیا تھا کہ لڑکی کو کیسے دیکھتے ہیں ۔

پھر وہ روپ نگر چلا گیا ۔ اسے ان چھٹیوں میں خالہ جان سے ملنے روپ نگر بھی تو جانا تھا ۔ کتنے برسوں کے بعد وہ روپ نگر کو پھر دیکھ رہا تھا ۔ گڑھے پڑی سڑک اُسی طرح گرد میں اٹی ، اُسی طرح جہاں تہاں پڑے ہوئے دو رویہ کنکروں کے ڈھیر ، اُسی طرح اکے اونچے نیچے راستوں پر ہچکولے کھاتے ہوئے اور اُسی طرح بیل گاڑیاں کچے رستوں پر رینگتی ہوئی ۔ یہ تو سب کچھ اُسی طرح ہے ۔ ایک اطمینان بھری حیرت کے ساتھ اس نے ایک ایک چیز کو دیکھا ۔ مگر سب کچھ اُسی طرح نہیں تھا ۔ اس کے ساتھ والے سب کے سب کتنے لمبے ہو گئے تھے ۔ ان کے چہروں کی رنگت پک گئی تھی ، آوازوں میں بھاری پن آ گیا تھا ۔ حبیب میٹرک

پاس کر کے علی گڑھ چلا گیا تھا اور اب چھٹیوں میں واپس آیا تھا تو اس کی سج دھج ہی اور تھی ۔ پائجامے کا کٹ بدل گیا تھا ۔ کہاں اس کے سر پر اُسترے کے بعد آم کی گٹھلی رگڑی جاتی تھی اور کہاں اب اس کے لمبے لمبے انگریزی بال تھے ۔ بندو کو بھی شریفن بوا نے تالوں کا کام سیکھنے کے لیے علی گڑھ بھجوا دیا تھا ۔

اور صابرہ ! صابرہ اب کتنی لمبی ہو گئی تھی اور سینہ اُس کا کتنا اُبھر آیا تھا کہ ہمیشہ اُسے دوپٹے سے ڈھکے رکھتی ۔ پھر بھی گول گول ابھار چھلکتے چھلکتے دکھائی دیتے ۔ اس سے تو وہ اب آنکھ بھی نہیں ملاتی تھی ، جیسے وہ اجنبی ہو ۔

گلی گلی ، بازار بازار گھوما ، گھومتا رہا ۔ ایک پیاسے کی طرح کتنے دنوں کے بعد وہ اس مانوس منظر سے سیراب ہو رہا تھا ۔ کس بے تابی کے ساتھ چیزوں کو دیکھ رہا تھا ، بے تابی کے ساتھ اور ہوس کے ساتھ جیسے سب کچھ نظر کی راہ اندر سمیٹ لینا چاہتا ہو ۔ چیزیں کبھی اُسی طرح نظر آتیں ، کبھی بدلی بدلی ۔ بجلی کے کھمبے کتنے زیادہ ہو گئے تھے اور بجلی کے تار کتنے پھیل گئے تھے کہ چھوٹی بڑیا کے سوا بھی پھیلے نظر آتے تھے ۔ بندر تاروں سے بچ کر ایک کوٹھے سے دوسرے کوٹھے پر چھلانگیں لگا رہے تھے ۔ روپ نگر کے بندروں نے بجلی کے زمانے میں جینا سیکھ لیا تھا ۔

کالے مندر سے کربلا تک ، کربلا سے قلعے تک ، قلعے سے راون بن تک سب کچھ اُسی طرح تھا ۔ دیر تک وہاں گھوما ، اس منظر میں اشنان کیا ، پر پوری آسودگی نہیں ملی ۔ جیسے وہ پُر اسراریت جو یہاں رچی بسی تھی ، رخصت ہو گئی ہو ۔ دور کھڑے ہو کر کالے مندر کو ، اس کے بڑے پیپل کو اور اس موٹے بندر کو جو سب سے اوپر والی ٹہنی پہ بیٹھا تھا ، اگلے پچھلے خوف کے تجربوں کو دھیان میں لاتے ہوئے دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں کوئی تحیر پیدا نہ ہو سکا ، نہ تحیر نہ خوف ۔ سب کچھ اُسی طرح تھا مگر شاید وہ بدل گیا تھا یا شاید اس کا وہ رشتہ برقرار نہیں رہا تھا — کالے مندر سے ، بڑے پیپل سے ، پیپل کے بندروں سے ، کربلا کی خاموش فصیل سے ، راون بن سے ، اس کے بیچ کھڑے بڑھ سے ، شاید صابرہ سے بھی ۔

نا آسودہ ، نا مطمئن ، تھکا تھکا واپس گھر آیا ۔ گرمی بہت تھی ۔ تولیا لیا اور دوپہر کی دھوپ میں تپتے صحن کو عبور کر کے غسل خانے کی طرف چلا ۔ غسل خانہ اب بھی اُسی پرانے انداز پر تھا کہ اندر باہر نہ کنڈی نہ چٹخنی ۔ اٹکل رہتی تھی کہ کوئی اندر ہے یا نہیں ہے ۔ شاید اب اس سے اٹکل نہیں رہی تھی کہ غسل خانے کے کواڑ کھولے اور پوری طرح کھولنے سے پہلے بند کر دیے ۔ آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی ۔

دیر تک بجلی ایسے اس لمحے میں کھویا کھویا رہا ۔ یہ سوچ کر حیران ہوا کہ طاہرہ باجی تو بالکل عورت ہیں ۔ اس دن تو ان سے آنکھ ہی نہ ملا سکا ۔ دوسرے دن آنکھ بچا کر ان کا سر سے پیر تک جائزہ لیا ۔ وہ پنڈا گورا گورا بھر بھرا اس کے تصور میں ابھر آیا ۔ اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ ۔ شرم سے اُس کا منہ لال پڑ گیا ۔ اپنے آپ پہ اس نے دل ہی دل میں کتنی ملامت کی ۔ مگر طاہرہ باجی کو سرے سے کوئی احساس ہی نہیں تھا ۔ اس سے بے تکلفی سے باتیں کیں اور کالج کی ایک ایک بات پوچھی ۔

"ذاکر ! تمہارے کالج کی لائبریری میں راشد الخیری کی 'شامِ زندگی' ہے ؟"

"جی ہے ۔"

"ہائے اللہ ! ذاکر اب کے آؤ تو 'شامِ زندگی' ضرور لے کے آنا ۔"

ناولوں کا ذکر ہوتے دیکھ کر صابرہ بھی جھجکتی جھجکتی آئی اور طاہرہ باجی کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گئی ۔ ناولوں کا ذکر کتنے شوق سے سن رہی تھی ۔ باورچی خانے سے خالہ جان کی آواز آئی ۔ "اری طاہرہ ہنڈیا تو دیکھ لے ، کہیں جل نہ جائے ۔ میں آٹا گوندھ رہی ہوں ۔"

طاہرہ باجی کے چلے جانے پر صابرہ سٹپٹا سی گئی مگر اُٹھ کے جا بھی نہیں سکی ۔ وہ خود بھی جھینپا جھینپا بیٹھا رہا ۔

رفتہ رفتہ حوصلہ پکڑا : "صابرہ ! تم نے 'فردوسِ بریں' پڑھی ہے ؟"

"نہیں ، کیسا ناول ہے ؟"

اس نے فوراً ہی "فردوسِ بریں" کا قصہ سنانا شروع کر دیا ۔ پورا قصہ سنا ڈالا ۔

"ذاکر ! ہمیں 'فردوسِ بریں' لا دو گے ؟"

''ہاں جب آؤں گا تو لے کے آؤں گا ۔"

"اب تم کب آؤ گے ؟"

"بڑے دن کی چھٹیوں پر ۔"

اس نے شرر کے اور کئی ناولوں کے قصے بھی سنائے ۔ مع ان تفصیلات کے جنھیں بیان کرتے ہوئے کچھ وہ جھجکتا ، کچھ وہ جھینپ جاتی مگر صابرہ اب اس کے ساتھ گھل مل گئی تھی ۔ گھر کے کام کاج سے تو اُس کا جی کچھ اچاٹ سا ہو گیا تھا ۔ اُدھر خالہ جان اور طاہرہ باجی گھر کے کاموں میں جتی رہتیں ، ادھر وہ اس کی باتیں سنتی رہتی ، اس سے باتیں کرتی رہتی ۔ باتیں کبھی زور زور سے ، کبھی دھیرے دھیرے ۔ کبھی اتنی دھیرے کہ باتیں سرگوشیاں بن جاتیں اور صابرہ کے چہرے پہ سرخی دوڑ جاتی ۔ اور جب اس نے بندوں کی تعریف کے بہانے اس کے کان کی لو کو چھوا تھا تو اس کا سانس ایک دم سے کتنا گرم ہو گیا اور کتنا تیز چلنے لگا تھا ۔ کتنی نرم اور گرم تھی وہ لو کہ ایک نرم گرم رو پوروں کی راہ اس کے اندر سرایت کرتی چلی گئی ۔

کتنی جلدی چھٹیاں ختم ہوگئیں ۔ روپ نگر اسے پکڑ رہا تھا مگر اسے آخر کالج پہنچنا تھا اور اس سے پہلے ویاس پور جا کر امی جان کو صورت بھی دکھانی تھی ۔

"ابے تو آ گیا ؟ تو تو ایک ہفتے کا کہہ کے گیا تھا اور اتنے دن لگا دیے ۔"

سریندر کی بات کے جواب میں اس نے پہلے کوئی ادھر کی بات کی کوئی اُدھر کی مگر راز کو وہ کتنی دیر چھپا کر رکھ سکتا تھا ۔

"پھر تو نے کیا کیا ؟"

"میں نے کیا کیا ؟ کیا کرتا ؟ کچھ نہیں ۔"

"جھوٹا ۔"

"سچ ، اس سے آگے کوئی بات نہیں ہوئی ۔"

"تو بہت گھامڑ ہے ۔" سریندر نے ملامت کی اور چپ ہو گیا ۔

پھر وہ آپ ہی آپ بولا : "یار اُس کے ہاتھ بہت نرم تھے ۔"

سریندر کی بیزاری دور ہوگئی ۔ "اچھا ؟"

"ہاں" چپ ہوا ، خیالوں میں غوطہ کھایا ، پھر بہت آہستہ سے بولا "اور ہونٹ بھی ۔"

"ہونٹ ؟" سریندر کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔

پھر وہ کھلتا چلا گیا ۔ جو یہاں پر بیان نہیں کر سکا تھا ، وہ اس نے کالج پہنچ کر ، جب اطمینان سے دونوں بیٹھے ، بیان کیا ۔ جب سب کچھ بیان کر چکا تو جو بیان کر چکا تھا اسے پھر بیان کیا ، اور پھر بیان کیا ۔ ہر مرتبہ یوں بیان کیا جیسے پہلی مرتبہ بیان کر رہا ہے ۔

"اچھا اب تو کب جا رہا ہے ؟"

"کرسمس کی چھٹیوں میں ۔"

"وہ تو ابھی دور ہیں ۔"

"ہاں یار ! وہ تو ابھی دور ہیں ۔"

"خط وط لکھ اُسے ۔"

"خط ، ہاں یار خط لکھنا چاہیے ۔" اور خط لکھنے کا سودا دنوں ہفتوں سر پہ سوار رہا ۔ روز قلم کاغذ لے کر بیٹھنا ، کچھ لکھنا ، پھر پھاڑ دینا ۔

"یار لکھا کیا جائے ؟"

"جو لکھنا چاہیے ۔"

"مگر یار ! اگر کسی اور نے خط پڑھ لیا تو ؟"

"تو ؟" سریندر سوچ میں پڑ گیا ۔ "اس نے تجھ سے ناولوں کے لیے کہا تھا نا ؟ بس تو یہ لکھ کہ مجھے ناولوں کے نام یاد نہیں رہے ۔"

"بالکل ٹھیک ۔"

پھر کرسمس کی چھٹیاں بھی آخر آ ہی گئیں اور اس نے راشد الخیری اور شرر کے ناول الماریوں میں سے ٹٹول ٹٹول کر نکالے اور اپنے کارڈ پہ جاری کرائے ۔

"یار تو روپ نگر تو نہیں جا رہا ہے ؟"

"کیوں نہیں جاتا ۔ جا رہا ہوں ۔ کل کالج بند ہوتے ہی نکل جاؤں گا ۔"

سریندر رکا ، پھر بولا : "یار مت جاؤ ۔"

"کیوں ؟"

"یار سفر لمبا ہے اور گاڑیوں میں گڑبڑ کی خبریں آ رہی ہیں ۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا ۔ "یار گڑبڑ تو یہاں بھی ہوتی نظر آ رہی ہے ۔"

"ہاں یہاں بھی کچھ گڑبڑ ہے ۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے ۔"

"پھر ؟"

سریندر نے سوچا ، پھر کہا : "ویاس پور چلتے ہیں ، دونوں مل کر ۔"

ویاس پور تک کا سفر کالے کوسوں کا سفر بن گیا ۔ جو مسافر زیادہ نقل و حرکت کرتا ، مشکوک دکھائی دیتا ۔ ویاس پور کا پلیٹ فارم کتنا خاموش تھا ۔ اور جب باہر آئے تو حیران رہ گئے ۔ "یار یہاں تو کوئی تانگہ ہی نہیں ہے ۔"

"پھر پیدل چلتے ہیں ۔ آخر دوسرے بھی تو پیدل جا رہے ہیں ۔"

تھوڑی دور تک آگے اور پیچھے گاڑی سے اُترے ہوئے مسافر پیدل چلتے نظر آئے ۔ پھر یکایک احساس ہوا کہ سڑک خالی ہے ۔ دور تک سڑک خالی نظر آ رہی تھی ۔ جگت ٹاکیز کہ اس راہ میں سب سے پُر شور مقام تھا بند تھا اور بالکل خاموش ۔ اس کی پیشانی پر خاصے دنوں سے جو ایک جھنڈا سا کھڑا تھا اور جس پر کانن بالا کی مورت مسکراتی رہتی تھی ، وہ بیچ سڑک پر گرا پڑا تھا ۔ کانن کی تصویر پھٹ چکی تھی اور دور تک اینٹیں بکھری پڑی تھیں ۔

"یار غلطی ہو گئی ۔" سریندر نے آہستہ سے کہا ۔ "آنا نہیں چاہیے تھا ۔"

پھر خاموش چلنے لگے ۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی اور دور تک کوئی آدمی نہیں تھا ۔ بس اینٹیں ہی اینٹیں ۔ اس نے خوف و حیرت سے ان بکھری اینٹوں کو دیکھا ، اتنی اینٹیں تھیں ویاس پور میں !

چلتے چلتے وہ میرٹھ دروازے پر آئے ۔ آگے سیدھی راہ پر کھڑکی بازار تھا جو بند پڑا تھا اور بے چراغ تھا ۔ یہ وہ راستہ تھا جو ہندوؤں کے محلوں میں جا نکلتا تھا ۔ برابر میں ایک گلی چلی گئی تھی جو مسلمانوں کے محلوں میں جاتی تھی ۔ اس دوراہے پر دونوں ٹھٹکے ، دونوں نے ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا اور الگ الگ رستے پر چل پڑے ——

"ذاکر بیٹے ! ارے کچھ سنا تو نے ، باہر گولی چل رہی ہے ۔"

"جی" اُس نے بدقت جنگل سے واپس ہوتے ہوئے امی جان کو دیکھا جن کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور آواز میں سخت گھبراہٹ تھی ۔

وہ اُٹھ کر کھڑکی تک گیا ۔ ایک پٹ کھول کر باہر نظر ڈالی ۔ جلسہ گاہ درہم و برہم تھی ، شامیانہ گرا پڑا تھا ، قناتیں کہیں کھڑی رہ گئی تھیں ، کہیں جھک گئی تھیں ، شامیانے کے ایک کونے سے دھواں اُٹھ رہا تھا ۔ بھگدڑ پڑی ہوئی تھی ۔ کچھ بھاگ رہے تھے ، کچھ سر پھٹول کر رہے تھے ۔ اس نے کھڑکی بند کی اور واپس آیا ۔ بڑبڑایا "بکواس ۔"

"اے ہے میں تو سوتے سے اچھل پڑی ۔ قیامت مچی ہوئی تھی ۔ پھر ٹھائیں سے آواز آئی ۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا ۔ اب تک کر رہا ہے ۔ میں نے تیرے باپ کو آواز دی کہ اجی میں نے کہا کہ سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو ؟ وہ بڑبڑائے کہ یہ بدبخت کسی بھلے مانس کو سونے دیں گے ؟ میں نے کہا کہ مجھے ایسا لگے ہے کہ گولی چلی ہے ۔ بڑبڑانے لگے کہ اب یہاں یہی ہوگا ۔ میں نے کہا کہ کوئی بات ہو یہ تو بڑبڑا کے رہ جاتے ہیں ۔ ذاکر کو جا کے بتاؤں ؟"

"کسی نے فائر کر دیا ہوگا ۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے ۔ جلسوں میں آج کل یہی ہوتا ہے ۔"

"اے بیٹے ! ایسے گولیاں چلیں تو کیا ہوگا ؟"

"کچھ نہیں ہوگا ۔ آپ جا کے اطمینان سے سوئیں ۔"

"تجھے یقین نہ آوے گا ، میں تو اندر سے ہل گئی ہوں ۔"

"امی کچھ نہیں ہوتا ، آپ جا کے سوئیں ۔"

امی کو جیسے تیسے رخصت کر کے اس نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی کھول کر باہر نظر ڈالی ۔ مجمع منتشر ہو چکا تھا ، گرے ہوئے شامیانے کے ساتھ جلسہ گاہ خالی پڑی تھی اور سارے بلب اُسی طرح جل رہے تھے ۔ شامیانے کے جس کونے سے پہلے بہت دھواں اُٹھ رہا تھا اب وہاں دھوئیں کی صرف ایک لکیر سی اُٹھ رہی تھی ۔

جلتی روشنی میں اُجڑی پجڑی خالی پڑی جلسہ گاہ کو دیر تک تکتا رہا ۔ وہ ایک لمبا سفر کر کے آیا تھا اور اب اپنے زمانے میں سانس لے رہا تھا ۔